

# دُھواں دُھواں پیرِ غِیاں

{ شعری مجموعہ }

عسلی الدین فویدؔ

مکتبہ شعراء و حکمت، حیدرآباد

- طبع اول
- سنہ اشاعت دسمبر ۱۹۹۳ء
- کتابت الفلاح کمپیوٹر مادیٹ حیدر آباد فون 521098
- طباعت اسپڈ پرنٹرز، فرح کالونی سعید آباد حیدر آباد
- ناشر مکتبہ شعر و حکمت 6-3-659/2 کپاڑیہ لین
- سولہ گزہ حیدر آباد 500004
- سرورق طالب خوند میری
- تزئین جمشید نوید سیما امروز، شہلا افروز، صبا فردوس،
- نغمہ شہروز، توصیف نوید، تجید نوید، توحید نوید
- قیمت ساٹھ روپے Rs. 60 = 00
- کتاب ملنے کے پتے:
- 1 مکتبہ شعر و حکمت 6-3-659/2 کپاڑیہ لین سولہ گزہ حیدر آباد 500004
  - 2 حسامی بک ڈپو، چارینار حیدر آباد۔
  - 3 سیل کاؤنٹرز نامہ سیاست جواہر لال نہرو روڈ حیدر آباد۔
  - 4 الکتاب پبلشرز گن فاؤنڈری حیدر آباد۔
  - 5 حیدر آباد لٹریچر فورم (حلف) 6-3-659/2 سولہ گزہ حیدر آباد۔
  - 6 مکتبہ جامعہ لکھنؤ جامعہ نگر۔ نئی دہلی، ممبئی۔
  - 7 شب خون کتاب گھر 313 رانی منڈی الہ آباد۔ ۳
  - 8 اسٹوڈنٹس بک ہاؤس چارینار حیدر آباد۔
  - 9 مصنف 16-3-410 چنچل گزہ حیدر آباد 500024 اے پی۔
- فون 24414443

یہ کتاب اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی مجروری مالی اعانت سے شائع کی گئی

## اِنْتَسَابُ

ہو ہنار کمنِ لختِ جگر  
 ”تنویرِ نوید“ مرحوم کے نام،  
 جس کی حادثاتی موت نے، زمین سے آسمان کی طرف  
 میری آنکھیں پھیر دیں

ایک پل میں خواب آنکھوں سے پگھل کر بہہ گئے  
 کھو گیا ہنستا ہوا بچپن، کھلونے رہ گئے

## فہرست

آئینہ پس آئینہ  
○ غزلیں

۷

۹

۱۱

دعائیہ

۱۳

۱۵

۱۷

۲۰

۲۱

۲۳

۲۴

۲۶

۲۷

۲۹

۳۰

۳۲

۳۴

۳۶

۳۸

۴۰

۴۲

۴۳

۴۴

۱

۲

۳

۴

۵

۶

۷

۸

۹

۱۰

۱۱

۱۲

۱۳

۱۴

۱۵

۱۶

۱۷

۱۸

۱۹

۲۰

جس سے دیواریں لرزنے لگیں ایوانوں کی

کریں تو کس پہ کریں اعتبار شہروں میں

دلوں کے درمیاں، نفرت کی ایسی کھائی نہ تھی

جانے کیا کہہ کر گیا جھونکا ہوا کا کان میں

جس کو جی جان سے چاہا، وہ پرایا نکلا

رفاقوں کے زمانے، سراب نکلیں گے

جاگتی راتوں کی ساری تازگی آنکھوں میں ہے

یوں سرِ شام در آئی تری خوشبو مجھ میں

لفظوں میں سانس لیتے ہیں، مرتے نہیں کبھی

خود کو حصارِ ذات کے اندر تو دیکھتے

تیز، منکبلی کرنوں پر، یوں وار کروں گا

صدیوں کی رات اوڑھ کے بیٹھے ہیں سب یہاں

نہیں ایسا، کہ کھوجاؤں گا صحرا کی صدا ہو کر

ہو رہے ہیں قتلِ دن میں، رات میں

آبرو منبر و ناقوس کی رسوا کیوں ہے

شبنم کی بوند بوند سے شعلے نکل گئے

جب تک تری آنکھوں کا اشارہ نہیں ملتا

خوشبو کی طرح شہر میں پھیلا نہ کریں گے

ریشمی لمحوں کی دل میں تازگی رہ جائے گی

- ۳۶ پھیلی ہوئی زمیں تھی، کھلا آسمان تھا ۲۱
- ۳۷ کنارے بیٹھ کے روتے تھے جن کو رونا تھا ۲۲
- ۳۸ سبز کمرنوں کی نظر جس کو خدا دیتا ہے ۲۳
- ۳۹ غم جب آنکھوں کا رکھوالا ہوتا ہے ۲۴
- ۵۰ آنگن میں تری یاد کی خوشبو جو اڑے گی ۲۵
- ۵۱ کیا سبب ہے، کبھی ہنسنا کبھی رونا ہے مجھے ۲۶
- ۵۲ شہروں میں سانس لینا بھی دشوار ہو گیا ۲۷
- ۵۳ جس کے دل میں زخم کا کاٹنا نہیں ۲۸
- ۵۴ میں کہا اور تیرا خواب کہاں ۲۹
- ۵۵ ہر ایک لمحہ فقط ٹوٹنا بکھر جانا ۳۰
- ۶۱ قتل کرنے کی مجھے جس نے قسم کھائی ہے ۳۱
- ۶۲ یہ بھی غلط نہیں کہ میں شعلوں کی زد میں تھا ۳۲
- ۶۳ سانس طوفان و تلاطم سے ابھی لڑتی ہے ۳۳
- ۶۴ ہمیں ریت کا گھر بنانا کہاں ہے ۳۴
- ۶۵ جھکولے کھائے ہے سپنوں کی ناؤ رات گئے ۳۵
- ۶۶ روزِ اوّل ہی سے کانٹوں کا بچھونا ہے مجھے ۳۶
- ۶۷ جب سے دل نے اوڑھ لیا ہے زخموں کا پیرا ہن ۳۷
- ۶۸ جب تک تمہاری راہ گزر تک نہ آئے گی ۳۸
- ۶۹ صبا کو صحن چمن کا جو راستہ نہ ملا ۳۹
- ۷۰ بجھ گئے خواب آنکھ ملتے ہی ۴۰
- ۷۱ دھڑکی کا تو کسی اور کا سر گلتا ہے ۴۱
- ۷۲ جس طرف آنکھ اٹھاؤ ترا چہرہ دیکھوں ۴۲
- ۷۳ بدن سمیٹ کے لائے ہوئے ہو صحرائی ۴۳
- ۷۴ روشن تھایوں حجاب سے اُس کے نشین کا رنگ ۴۴
- ۸۰ جانے کیا ہے عمر رفتہ کی نشانی آنکھ میں ۴۵
- ۸۲ جو دن میں بھی اندھیرا دیکھنا ہے ۴۶

۸۵	۴۷	کیا بات ہے آئے نہیں پتھر کئی دن سے
۸۶	۴۸	گردن پہ وار کر کے جو خنجر اٹھالیا
۸۸	۴۹	شہر کے نام پہ صحرا نہیں دیکھا جاتا
۹۰	۵۰	دُشوار کس قدر ہے یہ جاں کا سفر نہ پوچھ
۹۳	۵۱	رہے خیال کہ نازک بہت سخن ہے غزل
۹۵	۵۲	متفرق اشعار
۹۷	۵۳	نظمیں
۹۹	۵۴	چاند کا زخم
۱۰۰	۵۵	خداوند! میں راضی ہوں
۱۰۳	۵۶	دور درشن
۱۰۵	۵۷	یہ درد ہی دوا بنے
۱۰۶	۵۸	بولتا چراغ بجھ گیا (نذر فیض احمد فیض)
۱۰۹	۵۹	آگہی
۱۱۰	۶۰	عشرتِ قطرہ
۱۱۱	۶۱	تعاقب
۱۱۲	۶۲	سوال
۱۱۴	۶۳	نیند
۱۱۵	۶۴	ردِ عمل
۱۱۷	۶۵	سعیِ رائیگاں
۱۱۸	۶۶	انتباہ
۱۱۹	۶۷	دکن کے کہسار
۱۲۲	۶۸	وہ چہرہ
۱۲۴	۶۹	کیوں؟
۱۲۵	۷۰	وہ البیلا مخنور (نذر تاج مہجور)
۱۲۷	۷۱	ہم خطا وار ہیں آئے خدا

بسم اللہ تعالیٰ  
 ائینہ پس ائینہ

شاعری جدید ہو یا قدیم اپنے عہد کی غماز ہوتی ہے۔ ہر عہد اپنے ساتھ اپنا مخصوص ڈکشن، اور پیرائے اظہار لاتا ہے۔ ان شعری آوازوں میں سے کئی آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے چونکا دینے والے اظہار کے سہارے دو چار قدم چل کر دم توڑ دیتی ہیں۔ اور صرف وہی آوازیں تخلیقی طور پر زندہ رہتی ہیں جو اپنے اندر عصری آگہی اور نئی حسیت کو جذب کر کے اظہار و اسلوب کے سانچے میں اس طرح ڈھل جاتی ہیں کہ ان میں اپنے عہد کے خدو خال جھلکنے لگتے ہیں۔ اور یہ آوازیں اپنے عہد کی دھڑکن بن جاتی ہیں۔

نئی شاعری کی ریل اگر صرف علام اور ابہام کے کھردرے اور سپاٹ اظہار کے سہارے منڈوے چڑھنے والی ہوتی تو کتنے ہی ایسے شاعر جنہوں نے اس طرز کو اپنایا تھا آج تخلیقی طور پر زندہ رہتے۔ لیکن آج ہمیں نہ کہیں "کاف کی کرسی پر کالی چاندنی لیٹی ہوئی نظر آتی ہے"۔ اور نہ کہیں "مرغ کی چونچ میں سورج"۔ لفظوں کی شعبد بازی نے دم توڑ دیا ہے۔ آج وہی شاعر و ادیب زندہ ہیں جن کے ہاں آج کے عہد کا سچا تخلیقی حسن جاری و ساری ہے۔

"دُھواں دُھواں چراغ جاں" (دوسرا شعری مجموعہ) میری زندگی کے پچھلے چودہ زمیوں (۱۹۹۳ء - ۱۹۷۹ء) پر چڑھتے اُترتے موسموں کی دھوپ چھاؤں کا تخلیقی لبادہ ہے۔ وہ دھواں جسے میر نے ہر صبح سیٹھ فلک سے اُٹھتے ہوئے دیکھا تھا میرے عہد کے جلتے بجھتے چراغوں کا مقدّر بن گیا ہے۔ تابکاری زہر میں ہر سانس، ہر پیاس۔ ہر خواب دھواں دھواں سا ہے۔

لفظ و معنی کے پھیلے ہوئے اس جنگل میں آپ کو کہیں وہ کانٹے بھی ملیں گے جنہیں میرے احساس کی آنکھ نے ہلکوں سے اُٹھایا ہے۔ اور کہیں دل گداختہ کی چنگاریاں، چشم گریاں کی گھکاریاں، دورن ذات کے اندھیروں، اجالوں کی لالہ زاریاں، کائنات کے جلتے

بُجھتے الاؤ کی شعلہ باریاں آپ کے ذہن میں جھلملائیں گی۔

اپنے پہلے شعری مجموعے ”صدقت تمام ریت ریت“ (۱۹۷۹ء) میں، میں نے اپنے تخلیقی رویے سے متعلق لکھا تھا کہ ”شاعری میرے نزدیک نہ تو محض صناعی ہے اور نہ ہی تبلیغ، تحریک یا ادارے کا پلیٹ فارم۔ میرے احساس کی آنکھ کسی مخصوص عینک کی تابع نہیں۔ گرد و پیش کے واقعات کا کسی فن کار کے لاشعور میں جذب ہو جانا استثنائی فطری عمل ہے جتنا کہ کسی مستحکم کیرے کا اپنے احاطے میں آئے ہوئے ہر منظر کو اپنی گرفت میں لے لینا۔ اور تخلیقی عمل۔ میری دانست میں شعور و لاشعور کے درمیان سانس لیتی ہوئی اس سوچ کا نام ہے جو کسی نامعلوم لمحے میں ”زبان، طرز، آہنگ اور اسلوب میں ڈھل جاتی ہے

معاشرے کا کرب، ٹوٹتے، بکھرتے، بنتے، بگڑتے لمحوں کی رفاقت، اقدار کی زوال پذیری، ارتقاء کے نام پر تہذیب کی بربریت، ایسے کئی محرکات میرے اندر ایک جذر و مد کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو بلبلوں کی مانند میرے لاشعور سے شعر کی صورت ابھرتے ہیں

صرف ذہانت کے بل بوتے پر شعر کہنا میری نگاہ میں مصنوعی عمل ہے۔ ”دلِ گداختہ کو تخلیق کے لیے خمیر مانتا ہوں۔

آج جب کہ ادب کے میدان میں تحریکیں دم توڑ رہی ہیں، شعر کہنا میرے اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

میری قامت کا پیمانہ، میرے شعری مزاج کا آئینہ، میرے فکر و فن کا نگار خانہ تو اُن دیدہ و روں کی آنکھوں میں ہے۔ جن کی نگاہیں آئینہ در آئینہ جھلملاتے عکس کے علاوہ پس آئینہ بھی دیکھ سکتی ہیں۔

تو آئیے۔۔۔۔۔



علی الدین نوید

دھویں میں۔۔۔ آنکھیں کھولیں

دسمبر ۱۹۹۳ء

جبر آباد



غَزَلِكَيْنِ

یہ نہیں کہتا کہ میں اندھوں میں تھا  
 آنکھ ٹہ والوں نے مجھے دیکھا نہیں

## دُعائیں

میری رگ رگ میں اپنا نور بھروے  
میں پتھر ہوں مجھے آئینہ کر دے

نفس کی آگ کو جو موم کر دے  
تو میری خاک میں ایسا شرر دے

قلم جب ہاتھ میں تو نے دیا ہے  
تو کاغذ پر بھی چلنے کا ہُمر دے

رجاب ایسا بھی کیا اپنی زمیں سے  
اُٹھادے آسمانوں کے چہ پردے

افق کے پار جو منظر ہے، دیکھوں  
نظر والے ! مجھے ایسی نظر دے

میں اپنی جستجو میں کھو گیا ہوں  
مجھے تو میرے ہونے کی خبر دے

ہری ڈالی پہ اک لمحہ تو بیٹھوں  
پھر اُس کے بعد میرے پر کتر دے

مجھے سورج کی بنیائی عطا کر  
مجھے کرنوں کا اندازِ سفر دے

جو تیری راہ میں چلنے نہ پاؤں  
تو میری سانس کا پیمانہ بھر دے

میری سانسوں میں شعلے بھر گئے ہیں  
خداوند! متاعِ چشمِ تر دے

نویدِ جانفزا پھر سے سنا دے  
مرے مولا! مدینے کا سفر دے



جس سے دیواریں لرزنے لگیں آیوانوں کی  
وہ تو آواز تھی ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی

ہوش مندوں کو آدا بھاگتی دیوانوں کی  
دھجیاں شہر میں اڑتی ہیں گریبانوں کی

اب تو ذہنوں میں بھی بارود بچھی رہتی ہے  
جنگ باقی ہے کہاں، اب کھلے میدانوں کی

یہ الگ بات، کہ چہرے پہ کہیں دُھول نہیں  
خاک چھانی ہے بہت ہم نے بیابانوں کی

خواب ، آوازیں ، ممتنائیں ، مہکتے سائے  
گھر کے دروازے پہ اک بھیر ہے مہمانوں کی

دولتِ کون و مکاں لے کے نہ دیں ہم جس کو  
غم وہ جاگیر ہے ہم بے سروسامانوں کی

میری آنکھوں میں کبھی دُوب کے دیکھو تو سہی  
اب بھی رعنائی ہے گم گشتہ خیابانوں کی

آج اک موج کے ہاتھوں میں ہے لرزاں وہ نوید  
جس نے موڑی تھی کلائی کبھی طوفانوں کی



کریں تو کس پہ کریں اعتبار شہروں میں  
 بدن پہ سایہ بھی کرتا ہے وار شہروں میں  
 جو کوئی پاس سے گُزرے تو خون پی جائیں  
 یہ آدمی ہیں کہ زبلی کے تار شہروں میں  
 شکاریوں سے کہو ، جنگلوں سے لوٹ آئیں  
 درندے پھرتے ہیں اب بے شمار شہروں میں  
 کسی بھی عید یا تہوار گاؤں سے آنا  
 جو دیکھنا ہے بچنوں کی بہار شہروں میں  
 دُھواں ہیں منبر و ناقوس کے اُجالے بھی  
 زمیں سے تابہ فلک ہے غبار شہروں میں

ہر ایک شام نہ جانے کدھر نکلتے ہیں  
 یہ پھڑپھڑاتے پرندوں کے ڈار شہروں میں  
 اُتر کے گنبدِ بامِ فلک کی خلوت سے  
 ہماری طرح بس اک پل گزار شہروں میں  
 بدن پہ چہرہ نہ ہو بھی تو کیا قباحت ہے  
 اب آئینے کہاں ملتے ہیں یاد شہروں میں  
 ہر ایک شخص تعارف میں اپنے گم ہے نوید  
 کسی کا نام نہ لیکر پکار شہروں میں





دلوں کے درمیاں نفرت کی ایسی کھائی نہ تھی  
 ہزار عیب تھے پُرکھوں میں یہ بُرائی نہ تھی  
 شِشکستہ ہاتھ میں پتوار جب تک آئی نہ تھی  
 ہماری ناؤ بھنور میں بھی ڈمگائی نہ تھی  
 بدن کو چھوڑ کے جانا نہ میں تو کیا کرتا  
 سوائے اس کے کوئی صورتِ رہائی نہ تھی  
 نجات مل نہ سکی رات کی سیاہی سے  
 کبھی دیا ، کبھی گھر میں دیا سلائی نہ تھی

مکان خالی نظر آرہا تھا مکھیا کا  
ندی کی باڑھ ابھی گاؤں تک بھی آئی نہ تھی

تمھاری یاد کا دامن نصیب ہونے تک  
ہماری آنکھ کبھی کھل کے مُسکراتی نہ تھی

مرنے مکان میں رگھی کے چراغ کیا جلتے  
امیرِ شہر کے گھر تک مری رسائی نہ تھی

اس اعتبار سے بچے ہیں میرے خوش قسمت  
مرے نصیب میں اجداد کی کمائی نہ تھی

بدن میں دونوں کے بہتا تھا ایک ہی پانی  
 ندی سے پھر بھی سمندر کی آشنائی نہ تھی  
 متاعِ قسیر و کسریٰ تھی اُن کے قدموں میں  
 اُنہیں کے گھر میں پہنچانے کو اک چٹائی نہ تھی  
 ٹپک پڑی تھی قلم سے جو خط کے آخر میں  
 کچھ اور چیز تھی اے دوست ! روشنائی نہ تھی  
 ٹٹھاری فکر کا چہرہ بھی کھل گیا ہم پر  
 فقط کتاب کی وہ رسمِ رونمائی نہ تھی



جانے کیا کہہ کر گیا جھونکا ہوا کا کان میں  
پھول پتھر بن گئے ہیں کانچ کے گلڈان میں

سب کو اپنی اپنی دُھن ہے، سب کو اپنی اپنی فکر  
زندگی ہے، یا کھڑے ہیں حشر کے میدان میں

تشنگی ہونٹوں کی آنکھوں میں اُتر جائے اگر  
بوند بھی دریا نظر آتی ہے ریگستان میں

دن کا رستہ تکتے تکتے آنکھ دُھندلانے لگی  
اور کتنی دیر ہوگی صبح کے اعلان میں

جتنے غنچے تھے مرے آنگن میں، تارے بن گئے  
اک ذرا تازہ ہوا آئی جو روشندان میں

دل کی تابانی میں کوئی فرق تو آیا نہیں  
کتنے سورج بجھ گئے اس قصرِ عالیشان میں

شہر کی پُر شور سڑکوں پر تو پھرتا ہوں نوید  
نیم شب مرگھٹ کا سناٹا ہے لیکن جان میں



جس کو جی جان سے چاہا، وہ پرایا نکلا  
 میں جسے جسم سمجھتا رہا، سایہ نکلا  
 سائپ ہی سائپ نکل آئے گلی کوچوں سے  
 شہر میں رہین بجاتا جو سیرا نکلا  
 فرشِ گل بن کے میں راہوں میں تری پھیل گیا  
 تو یہ سمجھا کہ ترے پاؤں کا کامٹا نکلا  
 خوں بہا مانگنے جائیں بھی تو کس کے در پر  
 حاکمِ شہر ہی سر کاٹنے والا نکلا  
 ہم نے جب رات کے سینے میں اتر کر دیکھ  
 کل کے ڈوبے ہوئے سورج کا اُجالا نکلا

خود سے گھبرا کے جب آئینے کی جانب دیکھا  
 میرے چہرے سے کوئی دوسرا چہرہ نکلا  
 آنڈھیوں نے تو بہت زور لگایا لیکن  
 خشک پتوں کے سوا گھر سے مرے کیا نکلا  
 ہر نئی چوٹ تھی گم گشتہ چراغوں کا نشان  
 ہر نئے زخم سے اک زخم پُرانا نکلا  
 مجھ کو جس درد نے جینے کا سلیقہ بخشا  
 رات اُس درد کا آنکھوں سے جنازہ نکلا  
 آسمان اور زمیں اس میں سمٹتے دیکھے  
 دل کا ویرانہ عجب آئینہ خانہ نکلا  
 رات کو آنکھوں میں کب تک یوں رہ بٹھاؤ گے نوید  
 اب تو سوجاؤ میاں! صبح کا تارہ نکلا



رفاقتوں کے زمانے، سراب نکلیں گے  
پلک جھپکتے ہی آنکھوں سے خواب نکلیں گے

ہم اپنے دور کی بے چہرگی پہ کیا روئیں  
شکستہ پیڑ کے پھل ہی خراب نکلیں گے

زمین کے بھی کچھ اپنے اُصول ہوتے ہیں  
بہول بویں تو، کیونکر گلاب نکلیں گے

چھپا دو گلیوں کو، سڑکوں کے زخم دھو ڈالو  
کہ شہر دیکھنے عزت مآب نکلیں گے

ہمارا قتل نئے بال و پر ہمیں دے گا  
ہر ایک قطرہ خوں سے عتاب نکلیں گے

اسی زمین کی مٹی سے ہم بنے ہیں نوید  
اسی زمین سے روزِ حساب نکلیں گے



جاگتی راتوں کی ساری تازگی آنکھوں میں ہے  
 دن نکل آیا ہے لیکن چاندنی آنکھوں میں ہے

بند پلکوں کے جھروکوں میں ہیں میرے روز و شب  
 کھول دے آنکھیں کہ میری زندگی آنکھوں میں ہے

آئینے سے بچ کے رہنا، تجھ کو جینا ہے اگر  
 دیکھ اے قاتل ! مری صورت تری آنکھوں میں ہے

کالے کاغذ پر لکیریں کھینچتا ہوں بے سبب  
 کیا کروں ، اس دور کی بے چہرگی آنکھوں میں ہے

سادگی میں بھی انوکھا بانکپن رکھتے ہیں ہم  
 دل فقیرانہ ہے شانِ خسروی آنکھوں میں ہے



ورنہ آنکھیں تو فقط اک حلقہ بے نور ہیں  
 سچ تو یہ ہے ، ذہن و دل کی روشنی آنکھوں میں ہے  
 سبز کھیتوں کا دوسپہ اوڑھ کر لیٹی ہوئی  
 سوندھی مٹی سے بنی دوشیزگی آنکھوں میں ہے  
 جس پہ پڑجائے نظر ، پانی وہ مانگے عمر بھر  
 کس غضب کی آگ تیری شبہنی آنکھوں میں ہے  
 وقت کے سیلاب میں ایک ایک منظر بہہ گیا  
 ہاں مگر لے دے کے اک تیری گلی آنکھوں میں ہے  
 میر و غالب کی تو عظمت دل میں ہے میرے نوید  
 فیض و ناصر کاظمی کی شاعری آنکھوں میں ہے



یوں سرِ شام در آئی تری خوشبو مجھ میں  
رات بھر بجتے رہے لقرنی گھنگرو مجھ میں

صُورتِ زخم مہکتا جو رہے تو مجھ میں  
ابھی جائے گی کسی روز تری خوشبو مجھ میں

لوگ بیٹھے ہیں لگائے ہوئے آنکھیں کب سے  
کوئی کمزور لکل آئے نہ پہلو مجھ میں

میں نہ ساون ، نہ برسا ہوا بادل ، پھر بھی  
جانے کیوں اڑتے ہیں سہمے ہوئے جگنو مجھ میں

آسمانوں کے سفر میں میں اکیلا تو نہیں  
سبز پرچھائیں کی جب تک رہے خوشبو مجھ میں

مجھ کو باہر کی ہواؤں کا کوئی خوف نہیں  
سمر اٹھاتے ہیں کچھ آسیب گھریلو مجھ میں

میری ہر بات کو تولے ہے شب و روز نوید  
وہ جو بیٹھا ہے کوئی لے کے ترازو مجھ میں



لفظوں میں سانس لیتے ہیں ، مرتے نہیں کبھی  
اہلِ سخن ، جہاں سے گزرتے نہیں کبھی

احساسِ اس قدر ہے اُنہیں اپنے حُسن کا  
وہ آئینے کے پاس ٹہرتے نہیں کبھی

ہم ٹوٹتے ہی کم ہیں ، مگر ٹوٹنے کے بعد  
باہر وجود کے تو بکھرتے نہیں کبھی

گہرے سمندروں کی بھلا کیا خبر اُنہیں  
آنکھوں کی جھیل میں جو اُترتے نہیں کبھی

یہ سب تمہارے حُسن کے پُر تو کا فیض ہے  
آئینے خود بخود تو سنورتے نہیں کبھی

سہمے ہوئے ہیں اتنے خود اپنے وجود سے  
ہم سامنے سے اپنے گزرتے نہیں کبھی

نظارے آسماں کے، زمیں پر نہ ڈھونڈیے  
آنکھ میں چاند تارے اُترتے نہیں کبھی

گہرے کچھ اور ہوتے ہیں مرہم سے، وقت کے  
جو زخم دل کے زخم ہیں، بھرتے نہیں کبھی

رجن کے بدن پہ چہرہ سلامت رہے نوید  
وہ آئینے کے ذکر سے ڈرتے نہیں کبھی

خود کو حصارِ ذات کے اندر تو دیکھئے  
جالے تنے ہوئے ہیں میاں ، گھر تو دیکھئے

کھلتے ہیں کیسے کیسے شگوفے نگاہ میں  
تازہ ہوا کے سامنے جا کر تو دیکھئے

بارش میں بھینگے کا مزہ آئے گا جناب !  
اشکوں کے درمیاں کبھی ہنس کر تو دیکھئے

ساحل پہ سارے لوگ ، بھنور میں ہے نا خدا  
کشتی کے ڈوب جانے کا منظر تو دیکھئے

دریا ہیں کتنے ، کتنے سمندر چھپے ہوئے  
ریگِ رواں کی تہہ میں اتر کر تو دیکھئے

ترکِ تعلقات کا کھل جائے گا بھرم  
اک بار میری سمت پلٹ کر تو دیکھئے

بونوں کے دست و پاسے اُلجھتے ہو کیوں نوید  
آئینہ اپنے قد کے برابر تو دیکھئے



تیز ، منکلی کرنوں پر ، یوں وار کروں گا  
بادل بن کر دھوپ کا دریا پار کروں گا

باز بہت منڈلاتے ہیں میرے ہاتھوں پر  
اب شاخِ زیتوں کو میں تلوار کروں گا

قاتل کی آنکھوں میں میرے زخم رہیں گے  
مر کر بھی اُس کا جینا دشوار کروں گا

ختم بھی اپنی آنکھوں سے آواز نہ دینا  
میں بھی اپنے سائے کو دیوار کروں گا

جس کی چھت پر ہر دم روشن آگ رہے گی  
بارش میں ایک ایسا گھر تیار کروں گا

سوتے جاگتے ، آنکھوں میں چُھتے رہتے ہیں  
خوابوں کے سب آئینے مسمار کروں گا

ناصر بانی اور شکیب سے آنکھ ملا کر  
میں خود اپنے لہجے کا اظہار کروں گا

تیری یاد کے پیکر سے کچھ رنگ چُرا کر  
بجھر کی کالی راتوں کو گلنار کروں گا

بن کے نویدِ اک روز اُڑوں گا سبز پرندہ  
دُور اُفق پر بیٹھا ذکرِ یار کروں گا



صدیوں کی زات اوڑھ کے بیٹھے ہیں سب یہاں  
سُورج نکل بھی جائے تو پہنچے گا کب یہاں

یارب ! ترے مہاجر و انصار کیا ہوئے  
ہر گام پر کھڑے ہیں کئی بولہب یہاں

کانٹوں سے بچ گئے بھی تو کیا خیریت کہ اب  
پھولوں کو چومنے سے بھی جلتے ہیں لب یہاں

اس شہرِ بے اماں میں سلامت نہ تم نہ ہم  
شیشے کے بند کمروں میں سب جاں بہ لب یہاں

سج دھج کے شام نکلی ہے ، اہلِ نظر کی خیر  
دیکھیں نقاب اُترتے ہیں کتنوں کے اب یہاں

آنکھوں میں کس کا عکس لیے پھر رہے ہو تم  
پانی میں چاند ڈوب کے اُبھرا ہے کب یہاں



پتوں کی طرح ٹوٹ کے بکھریں گے ایک دن  
آنگن کا پیڑ بن کے تو ٹہرے ہیں سب یہاں

ہم کس شمار میں ہیں، ہماری رِباط کیا  
مانندِ گرد اُڑتے ہیں نام و نسب یہاں

ذہنوں میں تیز کانٹوں کے جنگل اُگے نہ تھے  
ہم اپنے گاؤں چھوڑ کے آئے تھے جب یہاں

سڑکوں کے پھیلنے میں، کتنی گھر رِسمٹ گئے  
سورج کے رتھ پہ بیٹھ کے اُتری ہے شب یہاں

پانی پہ لکھ رہے ہیں ہواؤں کی داستاں  
حرف و صدا کے آئینے، دیکھے عجب یہاں

کتبوں پہ نام لکھنے سے کیا فائدہ نوید  
پڑھتا ہے کون خاک نشینوں کو اب یہاں



مہنیں ایسا کہ کھوجاؤں گا صحرا کی صدا ہو کر  
 میں سنّاٹے میں بولوں گا تری آوازِ پا ہو کر  
 کبھی ایسا ہو، تو مجھ سے نظر پھیرے خفا ہو کر  
 میں تیرے دل میں اُتروں تیری آنکھوں سے جُدا ہو کر  
 مرے اعصاب میں اترے گا کڑوا ذائقہ ہو کر  
 مجھے آنکھیں دکھائے گا مرا بچہ بڑا ہو کر  
 جزیرہ ہوں مگر میرے لیے یہ بات کیا کم ہے  
 سمندر میرے پہلو میں کھڑا ہے آئینہ ہو کر  
 بکھرتے ٹوٹتے لمحوں میں ہم بھی سانس لیتے ہیں  
 ہمیں جینے کا فن آتا نہیں بے دَست و پا ہو کر

مرے سائے میں کل تک بُوئے گل انگڑائی لیتی تھی  
 بھٹکتا پھر رہا ہوں آج، جنگل کی ہوا ہو کر

یہ چیخیں، یہ کراہیں، یہ کٹے بازو، یہ جلتے گھر  
 ہمیں کھا جائیں گے سیلاب، آندھی، زلزلہ ہو کر

نوید اس شخص سے اب دُور ہی رہنے میں لذت ہے  
 کہ اس کی قُربتیں ڈسنے لگی ہیں فاصلہ ہو کر



ہورے ہیں قتلِ دن میں، رات میں  
امن کی سُرخِی ہے اخبارات میں

میرے آنگن ہی سے اُٹھتا ہے دُھواں  
گھر بھینڈی میں جلیں، میوات میں

قتل کر کے مجھ کو میرے سامنے  
لوگ شامل ہو گئے بارات میں

صُبح دم اخبار میں آجاؤ گے  
گھر سے مِت نکلا کرو اب رات میں

بھر بھی دل کی پیاس بجھتی ہی نہیں  
بھیگتا ہوں روز و شب جذبات میں

آئینہ سورج کو دکھلانے لگے

روشنی جن کو رلی خیرات میں

روتے روتے ہم اچانک ہنس پڑے

دھوپ کیا نکلی بھری برسات میں

ریت پر جب نام لکھتا ہوں ترا

پھول کیوں کھلتے ہیں میرے ہاتھ میں

رنگ و بو کا اک جہاں آباد ہے

دُوب کر دیکھو تو احساسات میں

مستیاں باغوں میں اُڑتی دیکھ کر

کھو گئے ہم ریشمی لمحات میں

اُن کے ذہنوں میں اندھیرا تھا نوید

جولنے پھرتے تھے سورج ہاتھ میں



آبرو مَنبر و ناقوس کی رُسا کیوں ہے  
روشنی سڑکوں پہ، ذہنوں میں اندھیرا کیوں ہے

میرا چہرہ تری آنکھوں میں کھٹکتا کیوں ہے  
آئینے! میری طرف دیکھ کے ہنستا کیوں ہے

تجھ کو دیکھوں تو مجھے یاد مری آتی ہے  
میرے قاتل! تُو میرے سامنے آتا کیوں ہے

خود شناسی کا یہ انداز بدل ائے ناداں!  
دھول چہرے پہ ہے آئینے بدلتا کیوں ہے

گھر کی تاریکی، سفیدی سے کہاں جاتی ہے  
جسم میلا ہے تو پوشاک بدلتا کیوں ہے

شام تک دُھوپ کی تلوار پہ چلنے والا  
 دن کی دہلیز پہ تھک ہار کے بیٹھا کیوں ہے  
 میری آنکھوں سے نکل جائے نہ صحرا بھی کہیں  
 مجھ کو تصویر سمندر کی دکھاتا کیوں ہے  
 میری تنہائی کو آئینہ دکھانے والے !  
 گھر کی دیواروں پہ آئینے لگاتا کیوں ہے  
 کس نے چنگاریاں بھردی ہیں فضاؤں میں نوید  
 سانس لیتا ہوں تو سنیہ مرا جلتا کیوں ہے



شبنم کی بُوند بُوند سے شعلے نکل گئے  
اس کی ہتھیلیوں سے مرے ہاتھ جل گئے

کیا دور آگیا کہ محبت کے نام پر  
سکتے ہوس کے کوچہ جاناں میں چل گئے

مقتل کے پاس تیری گلی یاد آگئی  
قاتل کے ہاتھ چومنے ہم سر کے بل گئے

بچوں کے ساتھ تجھ کو ترے گھر میں دیکھ کر  
جی خوش ہوا، پر آنکھ سے آنسو نکل گئے

آنگن کے جھلملاتے ستاروں کو چھوڑ کر  
ہم آسمان کے چاند کو چھونے محل گئے



کیا نقش تھے کہ موت کے ہاتھوں نہ مٹ سکے  
 کیا عکس تھے کہ آئینہ خانوں میں ڈھل گئے  
 ق

چُپکے سے آب و گل کا لبادہ اُتار کر  
 خوشبو کی طرح لوگ سفر پر نکل گئے

صحرا کہیں ، سراب کہیں ، دشتِ جاں کہیں  
 افسانے سب کے ایک ہیں، عنوان بدل گئے

حیرت تو یہ ہے صبح کی کرنوں کے ہاتھ بھی  
 اک شب گزیدہ دن مری آنکھوں پہ کل گئے

پھولوں کی پتیاں مرے ہونٹوں پہ پھیر کر  
 آنکھوں سے میر کی وہ سنا کر غزل گئے

جو دیکھنے میں موم کی مانند تھا نویدِ  
 اُس شخص کی نگاہ سے پتھر پگھل گئے



جب تک تری آنکھوں کا اشارہ نہیں ملتا  
کلیوں کو چٹکنے کا بہانہ نہیں ملتا

جس وقت بھی ریل جائے، ذرا غور سے سُننا  
سَنام سدا بولنے والا نہیں ملتا

یہ شہر ممتنا ہے، قدم سوچ کے رکھنا  
یاں دھڑ سے جُدا ہو کے بھی، چہرہ نہیں ملتا

میں جس کے لیے چھوڑ کے آیا سبھی رستے  
اب اس کی گلی کا مجھے رستہ نہیں ملتا

آنکھوں میں بسی رہتی تھی جس شخص کی صورت  
خوابوں میں بھی اب اُس کا سراپا نہیں ملتا

ہونٹوں کے قریب آنے کو پانی بھی ترس جائے  
ایسا کوئی پیاسا لبِ دریا نہیں ملتا



خوشبو کی طرح شہر میں پھیلا نہ کریں گے  
 اے جانِ ممتا ! تجھے رسوا نہ کریں گے  
 جلتے ہوئے لمحات کا آئینہ دکھا کر  
 ہم شہر کو شرمندہ صحرا نہ کریں گے  
 ہر شام پگھلتے ہوئے لمحوں کے اُفق پر  
 خوابوں کے نئے چاند تراشا نہ کریں گے  
 ہاں رسمِ وفا ہم کو بھی آتا ہے نبھانا  
 تم پاس سے گزرو بھی تو دیکھا نہ کریں گے  
 لہروں میں بھی ہیجان ملا دل ہی کی مانند  
 اب جھیل میں پتھر کبھی پھینکا نہ کریں گے  
 تو ایک چھلاوے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے  
 سائے کی طرح اب ترا بیچھا نہ کریں گے



ریشمی ٹمھوں کی دل میں تازگی رہ جائے گی  
پھول مڑھائیٹنگے پھولوں کی ہنسی رہ جائے گی

قتل سے پہلے مری آنکھوں میں اے قاتل نہ دیکھ  
بے گناہی میری، آنکھوں میں تری رہ جائے گی

بند ہو جائیٹنگے جب حرف و صدا کے راستے  
بات کرنے کے لیے اک خاموشی رہ جائے گی

کیا ہمارے شہر کے سب لوگ بہرے ہو گئے  
زندگی سڑکوں پہ کب تک چیختی رہ جائے گی

بُجھ کے رہ جائیں گے سارے علم و دانش کے چراغ  
غار میں اُتری ہوئی اک روشنی رہ جائے گی

دھوپ کے سائے میں طئے کرلو مسافت عمر کی  
چھاؤں رستوں میں کھڑی سُنہ دیکھتی رہ جائے گی

ایک پل وہ آئینے کے پاس ٹھہرے گا، مگر  
آئینے میں دیر تک اُس کی چھبی رہ جائے گی

چرخ جب زخمی پرندوں کی سُنے گا آسماں  
مدتوں تک اس کی آنکھوں میں نمی رہ جائے گی

گھر کے بچے بھی نہ سمجھیں گے زباں اپنی نوید  
صرف کاغذ پر ہماری شاعری رہ جائے گی



پھیلی ہوئی زمیں تھی کھلا آسمان تھا  
کھیتوں کے آس پاس جب اپنا مکان تھا

دہلیز پر جو سر تھے تو آنکھیں میں دھڑکتی  
یہ گھر وہی ہے جس میں مرا خاندان تھا

خوشبوئے جسم و روح کی ترسیل کے لیے  
جھونکا ہوا کا اُس کے مرے درمیان تھا

دانتوں میں مُردہ بھائی کی تھیں بوٹیاں ، مگر  
اُس کی جبیں پہ سجدوں کا روشن نشان تھا

لہروں کا ہاتھ تھام کے ، ساحل تک آگیا  
وہ شخص ، جس کا ٹوٹا ہوا بادبان تھا

ماں پھر رہی تھی ہاتھ میں کاسہ لئے ہوئے  
گھر تھا ، بہو تھی ، خیر سے بیٹا جوان تھا

اندر سے لہزہ لہزہ ہوئے تھے نوید ہم  
باہر سے جسم اپنا بظاہر چٹان تھا



کنارے بیٹھ کے روتے تھے جن کو رونا تھا  
ہمارا کام فقط کشتیاں ڈبونا تھا

وہ شخص گاؤں کا مکھیا تھا اور کام اُس کا  
گلاب جیسی زمیں میں ببول بونا تھا

یہ وقتِ شام ، یہ پگڈنڈیاں ، یہ تنہائی !  
کم از کم ایسے میں سائے کو ساتھ ہونا تھا

یہ اور بات اُسے کوزہ گرنے چھین لیا  
ہمارے گھر میں بھی نایاب اک کھلونا تھا

سمیٹ لائے ہم آنکھوں میں ساری شادابی  
تمہارے گاؤں کا موسم بڑا سلونا تھا





سبز کرنوں کی نظر جس کو خدا دیتا ہے  
پتھروں کو بھی وہ آئینہ بنادیتا ہے

قتل کرتا ہے نہ سُولی پہ چرہا دیتا ہے  
مجھ کو ہر لمحہ وہ جینے کی سزا دیتا ہے

طنز کے تیر نکلتے ہیں لبوں سے اُس کے  
وہ جو ہنستا ہے تو محفل کو رُلا دیتا ہے

آنکھ میں ڈوب کے گہرائی میں دل کی پہنچو  
یہ جزیرہ ہی سمندر کا ستہ دیتا ہے

موت کے ساتھ نکلتا ہوں تو ملتی ہے حیات  
زہر بھی اب مجھے اُمرت کا مزہ دیتا ہے





غم جب آنکھوں کا رکھوالا ہوتا ہے  
 راتوں میں بھی دن کا اُجالا ہوتا ہے  
 تعبیریں خود آنکھ بچاتی پھرتی ہیں  
 دیوانوں کا خواب زُلالا ہوتا ہے  
 کمرے میں تنہائی لیٹی رہتی ہے  
 ہاتھوں میں بس ایک رسالہ ہوتا ہے  
 تم چاہے دُنیا کی آنکھیں بند کرو  
 پھر بھی کوئی دیکھنے والا ہوتا ہے  
 میز ، کتابوں اور قلم کے پاس نوید  
 جانے کیوں مکڑی کا جالا ہوتا ہے



آنگن میں تری یاد کی خوشبو جو اڑے گی  
تہنائی مری پھول کی مانند کھلے گی

خاکستر جاں سے کوئی چنگاری اڑے گی  
مٹی کا دیا بجھتے ہی اک شمع جلے گی

سنائے میں کھوجائینگے دنیا کے جھمیلے  
خاموشی ہی آواز کا پیمانہ بنے گی

تم چاہے ہواؤں سے اسے لاکھ بچاؤ  
یہ جسم کی دیوار تو گر کر ہی رہے گی

ہاتھوں کی لکیروں میں یہ کیا ڈھونڈ رہے ہو  
حالات کی تحریر تو چہروں پہ ملے گی

سُورج نکل آیا ہے چلو ، کھُوج میں اپنی  
سایہ بھی نہ مل پائے گا جب دُھوپ ڈھلے گی

آرام سے جینے کی ہوس کسکو مہنیں ہے  
دُنیا ہے یہ آرام سے مرنے بھی نہ دے گی

میں تیرے لیے جاں سے گڈرجاؤں گا جس دن  
اخبار کی سُرخِی تری آنکھوں میں چُھے گی



کیا سبب ہے ، کبھی ہنسنا ، کبھی رونا ہے مجھے  
لوگ کہتے ہیں کہ جادو ہے نہ ٹونا ہے مجھے

روزِ اوّل ہی سے کانٹوں کا پنچھونا ہے مجھے  
دھوپ اوڑھے ہوئے لب تک یونہی سونا ہے مجھے

میری آواز کا چہرہ ہے سلامت جب تک  
شہر کی بھیر میں شامل نہیں ہونا ہے مجھے

جیسے تیسے بھی ہو ، کٹ جائینگے لمحوں کے پہاڑ  
سانس کا بوجھ تو ہر حال میں ڈھونا ہے مجھے

کہیں ایسا نہ ہو ، چہرہ ترا دھندلا جائے  
آئینے ! آج ترے سامنے ہونا ہے مجھے

نارسائی کی تمھکن ساتھ رہے گی جب تک  
 آپ کے شہر میں ہونا بھی نہ ہونا ہے مجھے  
 زخم کی مہکی ہوئی فصل اُگانے کے لیے  
 اک تری یاد کا موسم ہی سلونا ہے مجھے  
 جو کبھی ٹوٹ کے بکھرے تھے فضاؤں میں نوید  
 اُن ستاروں کو بھی اشکوں میں سمونا ہے مجھے



شہروں میں سانس لینا بھی دُشوار ہو گیا  
ہر شخص تیز دھوپ کی تلوار ہو گیا

پہلے تو صرف ذہن میں چنگاریاں اڑیں  
منظر پھر اس کے بعد دھواں دھار ہو گیا

میری انا ہی پاؤں کی زنجیر بن گئی  
میں خود ہی اپنی راہ میں دیوار ہو گیا

منزل شناس آنکھ دھواں ہو گئی نوید  
رہزن ہی آج کالا سالار ہو گیا



جس کے دل میں زخم کا کانٹا نہیں  
سانس لینا ہی اُسے آتا نہیں

لوگ اخباروں کے عادی ہو گئے  
ورنہ چہروں پر بھی کیا لکھا نہیں

یہ نہیں کہتا ، کہ میں اندھوں میں تھا  
آنکھ والوں نے مجھے دیکھا نہیں

آگ پلٹی ہے مسلسل ذہن میں  
یوں اچانک گھر کوئی جلتا نہیں

قتل ہو کر بھی میں اُس کے ساتھ تھا  
میرے قاتل نے مجھے دیکھا نہیں

دل سُلتا ہے قلم کی نوک پر  
 یوں ہی کاغذ کا بدن جلتا نہیں  
 آنکھ سے اونچھل نہ ہو جب تک زمیں  
 آسمان کا راستہ ملتا نہیں  
 سر پہ چادر دھوپ کی جب تک رہے  
 جسم سے سایہ جدا ہوتا نہیں  
 اُس کا کُچھ ہو کہ مُقتل ہو میاں  
 جو گیا اک بار پھر لوٹا نہیں  
 گھر سے باہر کیوں نکلتے ہو نوید  
 دھوپ پہننے کا اگر یارا نہیں





میں کہاں اور تیرا خواب کہاں  
شب کی قسمت میں آفتاب کہاں

روز مرنا ہے روز جینا ہے  
زیست سے بڑھ کے ہے عذاب کہاں

گفتگو لاکھ دِلنواز سہی  
خامشی کا مگر جواب کہاں

دُوبتا جا رہا ہے ہر منظر  
دیکھ پیہنچی ہے سطح آب کہاں

اب ولایں کہاں ہیں سینوں میں  
زخم بنتے ہیں اب گلاب کہاں

آسماں میرے سر پہ ہے ورنہ  
غم اُٹھانے کی مجھ میں تاب کہاں

موت لکھتی ہے جس کا دیباچہ  
ختم ہوتی ہے وہ کتاب کہاں

شور کیا ہے بند کمرے میں  
بھیڑ میں کھو گئے جناب کہاں

ایک دوجے کا آئینہ ہیں نوید  
حسن اور عشق میں حجاب کہاں



(نذرِ سلیمان الہی)

ہر ایک لمحہ فقط ٹوٹنا بکھر جانا  
 یہ زندگی ہے کہ کوئی شکستہ ہیمنہ  
 نہ جانے چھوڑ کے جانا ہے کب یہ میخانہ  
 کہ لمحہ لمحہ پھلکنے لگا ہے ہیمنہ  
 کوئی تو چہرہ نظر آئے جانا پہچانہ  
 یہ شہر شہر اگر ہے تو کیا ہے ویرانہ  
 دیارِ دردِ محبت کو جارہے ہو مگر  
 خود اپنے سائے سے ہونا پڑے گا بیگانہ

بھنور ہزار ہی راہ میں دل و جاں کی  
شکستہ ناؤ میں دریا کو پار کر جانا

صبا بھی چاک بہ داماں ہو جس کی فرقت میں  
کہاں ملے گا بتاؤ اب ایسا دیوانہ

تری گلی کو کہیں چھوڑ کر نہیں جاتا  
ترے دوانے کو کیسے کہوں میں دیوانہ

نویسہ سانس کی پتوار کا بھروسہ کیا  
بدن کی ناؤ جہاں تک چلے، چلے جانا





قتل کرنے کی مجھے جس نے قسم کھائی ہے  
کیا بتاؤں میں تمہیں ، وہ تو مرا بھائی ہے

سبز صحرا پہ سمندر کی گھٹا چھائی ہے  
اب زمیں حشر کے میدان کے قریب آئی ہے

میرے بچے! تری ہر بات میں گہرائی ہے  
تیری قامت سے زیادہ تری اونچائی ہے

تُو اگر پھیر لے آنکھیں تو میں اندھا ہو جاؤں  
تیری آنکھوں کی بدولت مری بینائی ہے

دل کی دنیا میں نہ لمحے ہیں نہ دن رات نوید  
آنکھ سے اڑتے پرندوں کی شنا سائی ہے



یہ بھی غلط نہیں کہ میں شعلوں کی زد میں تھا  
پانی کا رنگ بھی مرے خاکی جسد میں تھا

روزِ ازل زمین پہ تنہا کہاں تھا میں  
تیرا وجود بھی تو مرے خال و خد میں تھا

لوح و قلم ، زمان و مکاں سب دھواں دھواں  
اک سبز چاند چشمہ نورِ ابد میں تھا

پتھر بھی جس کو دیکھ کے آئینہ بن گئے  
کیا جانے کیا حُسنِ ترے خال و خد میں تھا

وہ جس ، وہ گھٹن ، وہ اندھیرا کہ کچھ نہ پوچھ  
تیرے بغیر جیسے میں برسوں لحد میں تھا



سانس طوفان و تلاطم سے ابھی لڑتی ہے  
 ناؤ ڈوبی ہے مری ، نبض کہاں ڈوبی ہے  
 موجیں مدہوش ہیں ، ساحل کی فضا بدلی ہے  
 شام دریا میں نہانے کے لیے اُتری ہے  
 شاخ زیتون کی نازک تو بہت ہے لیکن  
 پھول بارود کے پل بھر میں کھلا سکتی ہے  
 بند آنکھوں ہی سے دُنیا کا نظارہ کیجے  
 آنکھیں کھُل جائیں تو بینائی ہو روتی ہے  
 جھپٹے کا سا سماں ہوتا ہے ذہن ودل میں  
 میں تو چُپ رہتا ہوں تہنائی غزل کہتی ہے  
 ہوش مندوں کے ٹھکانوں ہی یہ ملتی ہے نویدِ  
 موت دیوانوں کی قربت سے بہت ڈرتی ہے



ہمیں ریت کا گھر بنانا کہاں ہے  
گھڑی دو گھڑی مُسکرا نا کہاں ہے

گلی چھوڑ کر تیری جانا ہے لیکن  
گلی چھوڑ کر تیری جانا کہاں ہے؟

نہ اشکوں کی نہریں نہ زخموں کی فصلیں  
خلاء میں مرا آب و دانہ کہاں ہے

میں طوبیٰ کی شاخوں پہ اڑتا پرندہ  
زمین پر مرا آشیانہ کہاں ہے

میرے لفظ منبر سے کب بولتے ہیں  
مرا لہجہ پیغمبرانہ کہاں ہے

ترپتا ہو دریا جسے چومنے کو  
نوید اب وہ پیاسا گھرا نا کہاں ہے





بھکولے کھائے ہے سپنوں کی ناؤرات گئے  
نہ اتنی تیز چلو ائے ہواؤ رات گئے

اکیلے پن کی نہ دیوار ڈھاؤ رات گئے  
خود اپنے سائے سے دامن بچاؤ رات گئے

لبوں کی دھوپ بدن میں اگر اتر جائے  
تو گیسوؤں کی گھٹاؤں میں جاؤ رات گئے

ہر ایک لمحہ اندھیروں کے کالے ساحل پر  
سحر کے اُجلے گھروندے بناؤ رات گئے

صَدَفُ صَدَفُ میں ہے سُورج کی آب و تاب نوید  
سمندروں کی ہتھوں میں نہ جاؤ رات گئے



روزِ ازل سے بس بھی چکڑ ہے پاؤں میں  
ہم گھومتے ہیں مثلِ بگولا ہواؤں میں

صدیوں کی رات رینگ رہی ہے زمین پر  
ہم روشنی بکھیر رہے ہیں خلاؤں میں

پگھلنڈیاں اُداس تو پٹگھٹ تھے نیم جاں  
تیرے بغیر جب بھی گیا تیرے گاؤں میں

سب روح کے جمال سے محروم ہیں یہاں  
آنکھیں بھٹک رہی ہیں بدن کی گچھاؤں میں

کیا جانے کس کے نقشِ قدم چوم آئی تھیں  
گھنگرو سے بچ رہے تھے مسلسل ہواؤں میں

سُورج لپیٹا جائے گا اک روز اے نوید  
اڑ جائیں گے تمام سمندر ہواؤں میں



جب سے دل نے اوڑھ لیا ہے زخموں کا پیراہن  
آنکھوں کے امبر سے موتی برساتا ہے ساون

بستی بستی کوچہ کوچہ فرزانوں کا مدفن  
جنگل جنگل صحرا صحرا دیوانوں سے روشن

وقت بھی آدم خور ہے ، تازہ تازہ خوں پیتا ہے  
اس کے ہاتھوں سے ٹوٹے کتنی سانسوں کے بندھن

آنکھوں سے آنسو برسانا سب کو آتا ہوگا  
کم ہی لوگوں کو آتا ہے آنسو پینے کا فن

تم سے دل کا رشتہ جوڑے برسوں بیٹے لیکن  
پھر بھی ایسے شرماتی ہو ، جیسے تازہ دُلہن

شبنم کے آنسو پتے ہی کھل اُٹھتے ہیں غُنچے  
زخموں کی برکھا مانگے ہے تیری یاد کا گلشن

جب بھی تہنائی کی ناگن ڈس لیتی ہے مجھ کو  
تیرا لہجہ بن جاتی ہے میرے دل کی دھڑکن

جیسے رات کے ستارے میں مرگھٹ کی خاموشی  
برسوں سے آسیب زدہ ہے میرے من کا آنگن

دیکھ نویدِ اپنوں سے ہر گز اپنا دکھ مت کہنا  
اس سے اور گھنا ہوتا ہے دل میں زخموں کا بن



جب تک تمھاری راہگزر تک نہ آئے گی  
سُورج کی روشنی مرے گھر تک نہ آئے گی

آنکھوں میں روز و شب جو بٹھاو گے تم اُسے  
پاس ایسے آئے گی کہ نظر تک نہ آئے گی

جب تک امیرِ شہر کے گھر میں دھواں نہ ہو  
سڑکوں کی آگ اُس کو نظر تک نہ آئے گی

چھپ کر رہے گی سانس کی مانند ائے نوید  
زخموں کی آگ دیدہ تر تک نہ آئے گی





صبا کو صحنِ چمن کا جو راستہ نہ ملا  
تری گلی سے گزرنے کا اک بہانہ ملا

زباں مُشکفۂ تو لہجہ پسیمبرانہ ملا  
مزاج ہم کو ازل سے قلندرانہ ملا

مُخلوص اُس کا ریا تھا، سُلوک اُس کا فریب  
اب ایسے شخص کا کیا غم، ملا ملا نہ ملا

میں شبِ گزیدہ، سحر کی کتاب کیا پڑھتا  
ورق ورق پہ وہی رات کا فسانہ ملا

خزاں رسیدہ شجر تھے بہار میں بھی نوید  
کسی بھی شاخ پہ پتہ کوئی ہر آنہ ملا



بُجھ گئے خواب آنکھ ملتے ہی

ہو گئی رات دن نِکلتے ہی

اِک 'ندامت کے اشک ڈھلتے ہی

دل ہوا آئینہ پگھلتے ہی

زندگی ! تھک تھکا کے بیٹھ گئی

دو قدم میرے ساتھ چلتے ہی

لوگ چہرے بدل بدل کے جئے

ہم رہے آئینے بدلتے ہی

دھوپ کو ڈھونڈتے پھرو گے نوید

جسم کا آفتاب ڈھلتے ہی



دھڑ کسی کا تو کسی اور کا سر لگتا ہے  
آئینہ ہاتھ میں لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے

جسم کی دھوپ سے جس وقت بھی ڈر لگتا ہے  
میرا سایہ مجھے مانندِ شجر لگتا ہے

رائیگاں جائے اب نیند کی وادی کا سفر  
ہر شجر خواب کا بے برگ و ثمر لگتا ہے

بند آنکھوں سے جو کرتا ہے نظارہ خود کا  
اک وہی شخص مجھے اہلِ نظر لگتا ہے

جانے کس موڑ پہ پہنچی ہے مری بینائی  
پھول کا رنگ بھی اب رنگِ شرر لگتا ہے



تیرے دل میں بھی کوئی زخم سُکّتا ہوگا  
تُو بھی ہنستا ہے تو بادیدہ تر لگتا ہے

پاؤں رکھتا ہوں تو قدموں کو زمیں ڈستی ہے  
سر اٹھاتا ہوں تو افلاک سے سر لگتا ہے

گھر کے اندر بھی سُکّتی ہوئی تنہائی نوید  
گھر کے باہر بھی نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے



جس طرف آنکھ اٹھاؤں ترا چہرہ دیکھوں

یہ نہ ہو پائے تو پھر خود کو میں اندھا دیکھوں

جاگتی آنکھوں سے موسم کوئی ایسا دیکھوں

پھول تو پھول ہیں ، کانٹوں کو بھی ہنستا دیکھوں

خار بن کر مری آنکھوں میں یہ چُجھ جائیں گے

میں ترے سامنے پھولوں کی طرف کیا دیکھوں

آنکھ تو آنکھ ہے ، احساس بھی دھندلانے لگا  
زندگی ! اور میں کب تک ترا رستہ دیکھوں

میری آنکھوں میں شب و روز لہکنے والے  
تیری آنکھوں میں کبھی اپنا سراپا دیکھوں

دور کہساروں پہ لہراتا پھروں ہر لمحہ  
شام کے ساتھ ہی میں اپنا بسیرا دیکھوں



بدن سمیٹ کے لائے ہوئے ہو صحرائی  
تم اپنا چہرہ کہاں چھوڑ آئے ہو بھائی ؟

بہت عجیب ہے یارو ، ہماری تنہائی

سمندروں کی کہاں نلپتے ہو گہرائی

نفسِ نفسِ تری آواز کی لچک ڈولے

نظرِ نظرِ ترے انداز کی پذیرائی

فصیلِ شب پہ کھڑے ، تک رہے ہیں دیوانے

نئی سحر کی زمیں پر صبا کی انگڑائی

نویدِ کاسۂ دلِ در بہ در لئے نہ پھرو

کہ اس سے ہوتی ہے اہلِ وفا کی رسوائی



روشن تھا یوں حجاب سے اُس کے نئین کا رنگ  
شبنم پہ جیسے صبح کی پہلی کرن کا رنگ

پھولوں میں، جُگنوؤں میں، ستاروں میں، چاند میں  
دیکھا کہاں کہاں نہ ترے بانکپن کا رنگ

بھیکے ہوئے لباس میں آیا تھا کون شخص  
اُترا ہے آئینے میں یہ کسکے بدن کا رنگ

میں جس طرف گیا، مرے قدموں میں آگیا  
صحرا کو بھاگیا مرے دیوانے پن کا رنگ

لب پر ہزار پردے تبسم کے ڈالے  
آنکھوں تک آہی جائے گا دل کی چُجھن کا رنگ

میں گردِ ماہ و سیال میں کھوجاؤں بھی تو کیا  
دیکھے گا اک زمانہ مرے فکر و فن کا رنگ

اندھے بتارہے ہیں اُجالوں کے خال و خد  
اب کیا دکھائی دے گا سحر کے بدن کا رنگ

پانی میں جیسے قوسِ قزح ڈولتی رہے  
یوں ڈولتا ہے من میں ترے پیرہن کا رنگ

پھولوں میں ڈھونڈتے ہیں جو خوشبو کے خال و خد  
اُن پر نہ کھل سکے گا ہمارے سخن کا رنگ

اُترا بس ایک پل کوئی پیکرِ نگاہ میں  
تنہائیوں میں پھیل گیا انجمن کا رنگ

کاغذ پہ کیسے اُترے گی تصویرِ اضطراب  
کب ایک رنگ ہوتا ہے بے چین من کا رنگ

سُورج نہیں، حُسینؑ ہیں سجدے میں وقتِ شام  
ہے کربلا کا خون، نہ سمجھو گلن کا رنگ

سرگوشیوں کی لے میں چمکتی ہیں ہر گھڑی  
کلیوں کی آنکھ میں ہے تمہارے سُخن کا رنگ

عُصَّہ تھا، پیار تھا، کہ ادا لے ستم نوید!  
ہم پر کھلا نہ اُس کی جبیں کی شِکَن کا رنگ



جانے کیا ہے عمرِ رفتہ کی نشانی آنکھ میں  
 آئینہ دیکھوں تو آجاتا ہے پانی آنکھ میں  
 لمحہ لمحہ ہو رہا ہے سبز کرنوں کا نزول  
 یا اُترتے ہیں صحیفے آسمانی، آنکھ میں  
 کوئی موسم ہو، روانی اس کی تھمتی ہی نہیں  
 بھر گیا ہے کتنے دریاؤں کا پانی آنکھ میں  
 روح کی آنکھوں سے کر نظارہ نورِ یقین  
 لامکانی حُسن کیا آئے مکانی آنکھ میں  
 اس کی خاموشی میں کیا کیا حُسنِ گویائی نہ تھا  
 ہونٹ سے بڑھ کر ملی جادو بیانی آنکھ میں



جب سے تیرا غم، مری پلکوں پہ لہرانے لگا  
کھل رہی ہے دو جہاں کی شاد مانی آنکھ میں

ہو رہی ہے ایک مدت سے یونہی شام و سحر  
ہجرتوں کے موسموں کی نوحہ خوانی آنکھ میں

جن کو کل تک اپنی پلکوں پر بٹھاتے تھے نوید  
چُھ رہے ہیں اب وہی لفظ و معانی آنکھ میں



جو دن میں بھی اندھیرا دیکھنا ہے  
تو آنکھیں کھول کر کیا دیکھنا ہے

نہ تیور ہی نہ لہجہ دیکھنا ہے  
غزل میں دل کا چہرہ دیکھنا ہے

نظر کے سامنے جب تم کھڑے ہو  
تو پھولوں کی طرف کیا دیکھنا ہے

تمہارے ساتھ ہے دُنیا کی رونق  
اکیلے رُکس کو میلا دیکھنا ہے

کسی کے غم کو آنکھوں میں بسا لو  
اگر دن رات اُجالا دیکھنا ہے

لگا ہے اُس کے جو بے حس بدن پر

وہ چہرہ ہے کہ کتبہ دیکھنا ہے

کسی غنچے کے لب پر کان رکھو

خوشی کا جو لہجہ دیکھنا ہے

خدا یا ! ایک لمحہ زندگی دے

مجھے قاتل کا چہرہ دیکھنا ہے

مرے بچے ! تری اُنکلی پکڑ کر

مجھے اپنا بڑھاپا دیکھنا ہے

ہمیشہ جھک کے دُنیا سے ملا کر

اگر قد اپنا اُونچا دیکھنا ہے

وہ پہلے دشت سے ہو کر تو آئے  
مکانِ رُجس کو ہمارا دیکھنا ہے

بس اب تو موت کی آنکھوں میں بس کر  
سراپا زندگی کا دیکھنا ہے

شکیب و ناصر و بانی کے جیسا  
نوید اب نام اپنا دیکھنا ہے



کیا بات ہے ، آئے نہیں پتھر کئی دن سے  
 سُنان سا لگتا ہے مرا گھر کئی دن سے  
 اے آسمان ! کیا تیری نگاہیں نہیں مجھ پر  
 لگتی نہیں دہلیز پہ ٹھوکر کئی دن سے  
 ہر چند کہ پیتے ہوئے لمحوں نے صدا دی  
 دیکھا نہیں ہم نے اُنہیں مُڑ کر کئی دن سے  
 کیا جلنے کیا ہو گیا بنیائی کو میری  
 آئینہ نظر آتا ہے پتھر کئی دن سے  
 ساحل پہ نوید آپ کھڑے سوچتے کیا ہیں  
 رہ رہ کے بلاتا ہے سمندر کئی دن سے



گردن پہ وار کر کے جو خنجر اُٹھالیا  
قاتل نے روتے روتے مرا سر اُٹھالیا

کانٹا ملا کہ پھول کہ پتھر ، اُٹھالیا  
راہوں میں جو ملا تری بڑھ کر اُٹھالیا

پانی میں چاند ڈوب رہا تھا کہ دوڑ کر  
تیرے بدن کا عکس سمجھ کر اُٹھالیا

کرفیو زرا اٹھا تھا کہ اندھے فقیہ نے  
کاسہ سمجھ کے ، ٹوٹا ہوا سر اُٹھالیا

بیگانگی کا اُس سے جو پوچھا کبھی سبب  
آئینہ میرے سلمے رکھ کر اُٹھالیا

سڑکوں کی سنگباری سے بچ کر جو گھر گیا  
دیوار و در نے ہاتھ میں خنجر اُٹھالیا

بارِ غمِ حیات ، اُٹھانا ضرور تھا  
 رو کر اُٹھالیا ، کبھی ہنس کر اُٹھالیا  
 ٹوٹی ہوئی کمان کی مانند تھا مگر  
 بیٹے کا بوجھ باپ نے سر پر اُٹھالیا  
 صحرا میں روزِ گار کی خاطر نکل گیا  
 سائے کا لطف دھوپ میں چل کر اُٹھالیا  
 پلکوں سے گر رہا تھا کہ دامن میں لے لیا  
 مجھ کو زمیں سے اُس نے فلک پر اُٹھالیا  
 اب گنبدوں پہ تیر چلاتے رہو نوید  
 پنچوں میں باز نے تو کبوتر اُٹھالیا



شہر کے نام پہ صحرا نہیں دیکھا جاتا  
آدمی بھڑ میں تنہا نہیں دیکھا جاتا

بس اسی خوف سے دیکھے نہیں سپنے ہم نے  
ہم سے تعبیر کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا

میری تقدیر مرے سلمے آجاتی ہے  
مجھ سے ٹوٹا ہوا تارہ نہیں دیکھا جاتا

آ، ترے ہونٹوں پہ میں اپنا تبسم رکھ دوں  
میرے قاتل ! ترا رونا نہیں دیکھا جاتا

سلمے تم ہو تو میں کیسے نظر آؤں گا  
روشنی میں تو اندھیرا نہیں دیکھا جاتا



میرے زخموں کو سبھی دیکھ رہے ہیں لیکن  
تیر کس سمت سے آیا نہیں دیکھا جاتا  
دل کی افسردگی جب ذہن پہ چھا جاتی ہے  
گھر کے بچوں کا بھی ہنسنا نہیں دیکھا جاتا

آسمان ڈھانپ دے اب اپنی زمیں پر یارب!  
جسم اب اس کا برسنہ نہیں دیکھا جاتا

دم آخر مرے چہرے سے ہٹالو نظریں  
دُوبتے وقت کنارہ نہیں دیکھا جاتا

پستیاں ذہن کی جب آنکھ میں آ جاتی ہیں  
قد کسی شخص کا اُونچا نہیں دیکھا جاتا

چرہتے سورج کی کڑی دھوپ سے بچنے کے لیے  
گرتی دیوار کا سایہ نہیں دیکھا جاتا

سر ہتھیلی پہ لیئے اس کی گلی جاؤ نوید  
جیتے جی موت کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا



دُشوار کس قدر ہے یہ جاں کا سفر نہ پوچھ  
کشتی کے آس پاس ہیں کتنے بھنور نہ پوچھ

آندھی کب آئی ٹوٹ گئے کب شجر نہ پوچھ  
گل کیسے ہو گئے ہیں چراغِ نظر نہ پوچھ

آنکھوں میں دیکھنے کی جو طاقت ہو جا کے دیکھ  
اک رات میں جلائے گئے کتنے گھر نہ پوچھ

میرے بدن میں ایک پرندہ ہے اور بھی  
پرواز کس کو کہتے ہیں 'پر کاٹ کر نہ پوچھ

احساس دیدہ ور ہو تو کیا منظروں کی قید  
بند آنکھ سے بھی آئے ہے کیا کیا نظر نہ پوچھ

مٹی کا ہے قصور کہ برگ و ثمر کا دوش  
 کیوں ٹوٹنے کو آئی ہے شاخِ شجر نہ پوچھ  
 گونگی سماعتیں ہوں تو بابِ سخن نہ کھول  
 ساحل کی رسیوں سے مزاجِ گہر نہ پوچھ  
 دانشورانِ شہر کے دل میں اُتر کے دیکھ  
 اونچی عمارتوں میں ہیں کیسے کھنڈر نہ پوچھ  
 خود کو سمیٹتے تو رہے رات بھر مگر  
 سورج کے ساتھ ساتھ بکھرنے کا ڈر نہ پوچھ  
 سڑکوں کی بھید بھاڑ میں مجھ کو بکھیر کر  
 تنہائی میری گھوم رہی ہے کدھر نہ پوچھ

کب تک بناتے جائینگے پانی پہ ہم لکیر  
کب تک نہ کام آئیگا اپنا ہنسر نہ پوچھ

جب سے ہے دل میں سبز اُجالوں کا آسماں  
پہنچی ہے کس مقام پہ میری نظر نہ پوچھ

چمگاڑیں کب آئیں کب آسیب بس گئے  
کس دن سے ہے درونِ بدن شور و شر نہ پوچھ

بارش میں بھیکتا ہوں شب و روز اے نوید !  
کیا جانے کب گرے گا یہ مٹی کا گھر نہ پوچھ

## ”غزل“

رہے خیال کہ نازک بہت سخن ہے غزل  
سخن کے پردے میں شیشہ گری کا فن ہے غزل

جو پھیل جائے تو ساگر ، سمٹ گئی تو ندی  
کسی حسینہ کی جادو بھری نشین ہے غزل

شفق ، دھنک ، گل و مہتاب ، مئے صبا ، جگنو  
ہزار طرح کے رنگوں کا پیرہن ہے غزل

حیا کی اوس میں بھنگی ، حنا میں ڈوبی ہوئی  
سہاگ رات کی شرمیلی اک دہن ہے غزل

ہو جیسے چاندنی راتوں میں عکسِ تاج محل  
وفا کی مرمریں باہنوں کا بانگپن ہے غزل

ہزاروں چاند ستارے ہوں جس کے دامن میں  
 وہ "جگمگاتا ہوا روشنی کا بن ہے غزل  
 ہر ایک دور میں ہے حسن و عشق کی آواز  
 زبان شیریں کی ، فرہاد کا دہن ہے غزل  
 شباب و حسن میں اس کا ہنسی کوئی ثانی  
 ہر ایک دور میں یوسف کا بانکپن ہے غزل  
 جو پڑھ سکو تو نظر کی زبان سے پڑھ لو  
 کسی بھی شوخ کے ماتھے کی بہ شکن ہے غزل  
 کچلتی ، جھومتی ، کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی  
 دکن کی پیاری تلنگن کا بانکپن ہے غزل  
 بچائے رکھنا زمانے کی بے حسی سے نوید  
 دیارِ سنگ میں شیشے کا اک بدن ہے غزل

## مُتَفَرِّقِ اشعار

اک سانس جو لیتا ہوں تو مرتا ہوں کئی بار  
 جینے کے لیے جاں سے گذرتا ہوں کئی بار



پتھروں کی بستیوں میں آئینے بو کر گیا  
 کیسا دیوانہ تھا ، کس انداز سے رو کر گیا



جس کا سر بارِ رعونت سے کبھی جھکتا نہ تھا  
 کل وہ میرے سامنے سے ہاتھ پھیلا کر گیا



گلاب و عطر کے دامن میں جا کے بستی ہے  
 نکل رہی ہے جو خوشبو ترے پسینے سے



نہ مانگو موت کبھی زندگی سے گھبرا کر  
 چراغِ گل نہ کرو روشنی سے گھبرا کر



سڑکوں پر سر مارے گی ، مر جائے گی  
تنہائی جب گھر سے باہر جائے گی



تم تو رُک جاتی ہو دروازے تک آ کر لیکن  
دُور تک چھوڑنے آتی ہیں تمہاری آنکھیں



شکیب و ناصر و بانی کی وہ پہچان رکھتے ہیں  
نظر کے سامنے جو میر کا دیوان رکھتے ہیں



خاموش جو رہیں تو خود اپنی فُغاں ہیں ہم  
دھڑکیں تو کاہنات کے دل کی زباں ہیں ہم



جاتو رہے ہو اُس کی گلی کے حدود میں  
اُس کی گلی ہے زُلف سی پیچیدہ ، دیکھنا





نظمیں

لوگ اخبّاروں کے عسادی ہو گئے  
 ورنہ چہشروں پر بھی کیا لکھنا نہیں؟

## چاند کا زخم

اکسن لختِ جگر "تنویر نوید" کی حادثاتی موت پر

موت کا پیغام تیرے ساتھ کیسے آگیا  
اے ہلالِ عید ! میرا چاند کیوں گہنا گیا

آشیانے سے نکلتے ہی قیامت آگئی  
طاثرِ بے بال و پر کو تیز آندھی کھاگئی

ایک پل میں خواب آنکھوں سے پگھل کر بہہ گئے  
کھو گیا ہنستا ہوا بچپن ، کھلونے رہ گئے

کس اندھیرے میں ، متاعِ گوش و چشم و لب گئی  
کسی بنیائی . منوں زمٹی کے نیچے دب گئی !

رات کی کھائی سے ہو کر صبح کے تٹ پر گیا  
چاند . سورج کے مقابل آتے آتے مر گیا

جگنوؤں کی مٹھناتی جوت میں تیرا ظہور  
غنیہ غنیہ تیری صورت ، بوما بوما تیرا نور

زندگی کو خوابِ غفلت سے جگا کر سو گیا  
روشنی کا دائمی رستہ دکھا کر سو گیا

خداوند! میں راضی ہوں

بیٹے تنویر کی جدائی پر —

کھلونا کیسے ٹوٹا

کیا بتاؤں

کھلونا کیسے ٹوٹا

کیا بتاؤں! —

نہ کانوں تک کوئی آواز آئی

نہ آنکھوں میں لہو کا بیل بٹوٹا

کھلونا کیسے ٹوٹا کیا بتاؤں!!

پرندے آشیانوں سے نکل کر

چلتی ڈالیوں پر جھومتے تھے

سحر کے عارض و لب چومتے تھے

ابھی نکلی نہ تھی بادِ بہاری

کہ ایسے میں —

اُفق سے۔

صف بہ صفِ نکلی فرشتوں کی سواری

مشیتِ اوڑھ کر

گھر پر مرے بارات اُتری

مُنوّر ساعتوں میں رات اُتری !!!

عمارت میں کئی جالے تنے تھے

کئی چمگاڑیں لٹکی ہوئی تھیں

چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔

اک زور کی آندھی تو آئی

اچانک کھڑکیاں سب کھل گئی ہیں

مرا کیا۔۔

میں ازل ہی سے

نئے زخموں کا عادی ہوں

خداوند!!

میں راضی ہوں!!!!

## دُور دَر شَن

آئینوں میں حسیں خواب کھلنے لگے

روشنی ذہن کی

آنکھ میں آگئی

آسماں اور زمیں

آنکھوں میں گلے آج ملنے لگے

ریشمی، نیلگوں، سبز پرچھامیاں

جھومتی، گنگنائی ہوئی ندیاں

نیت نئی ساز و آواز کی تتلیاں

مسجدوں، مندروں، گردواروں، کلیساؤں کی روشنی

کھڑکیوں، روزنوں اور دریچوں سے

چھن چھن کے آنے لگی

فاصلے مٹ گئے۔۔۔

سیمیں زمینوں پہ ٹھہری ہوئی

اے حسین نغمگی!

تیری آغوش میں

گھر مرا مثلِ صحرا ہنیں

میں اکیلا بھی رہ کر

اکیلا ہنیں!



## یہ ورد ہی دوا بنے



گردن سے پیٹھ --

پیٹھ سے پیروں تک اُگیا

یہ کیسا درد سارے بدن میں سما گیا

تیزاب بہہ رہا ہے رگوں میں کہ خون ہے

راتوں کو نیند ہے نہ ہی دن کو سکون ہے

بچھو کہاں سے آگئے گردن میں پیٹھ میں

جھنکار ہے یہ کسی رگ و پے میں رات دن

پھنکار سی ہے سڑھ کی ہڈی میں ہر گھڑی

جیسے نخاعی ڈور نہیں سانپ ہے کوئی

اعصاب ہیں کہ تار ہیں بجلی کے اے خدا !

کسی دہکتی آگ میں بہنے لگا ہوں میں !

کس جرم کی سزا ہے جو بہنے لگا ہوں میں ؟

سہہ لوں گا میں یہ درد ہمیں پر کسی طرح

مجھ کو بچائے رکھنا حساب و کتاب سے

یارب عذابِ حشر سے مجھ کو نجات دے !

# بولتا چراغ: مجھ گیا!

(نذر فیض احمد فیض)

مُہیب رات کھاگئی چراغ کو!

بس بھری مُہیب رات کھاگئی چراغ کو

سمندروں کے جذروں میں ڈولتا ہوا چراغ

صَدَف صَدَف گہر گہر ٹٹولتا ہوا چراغ

ہوا کی تیز قینچیوں کی زد میں بولتا چراغ

ناگ جیسے موسموں کا زہری کے

اُجلی، نیلی، سبز روشنی کو رولتا چراغ!!

زمین کی بوڑھی پیٹھ پر

لدا ہوا یگوں کا بوجھ

اپنے سر پہ لا دکر

نئے سفر کے اُجلے بادبان کھولتا چراغ

دہانِ زخِ م سے ---

دلوں کی بات بولتا چراغ

ہزاروں آنکھیں --

جس کی لو میں تھر تھراتی کانپتی

ہزاروں سانسیں --

جس کی ایک سانس میں گھلی ملی

خود اُس کی اپنی ذات میں

جھپی ہوئی ---

مُہیب رات کھاگتی چراغ کو

بس بھری مُہیب رات

کھاگتی چراغ کو

مُہیب رات !!!

# آگہی

ہواؤں میں تری خوشبورواں ہے

تجھے دیکھوں۔۔۔۔۔

وہ بنیانی کہاں ہے؟

# عشرتِ قطرہ

اگر ہر طرف

تو ہی تو ہے.....

تو پھر

میں کہاں ہوں؟

# تعاقب

درختوں کے پیچھے

پگھلتے ہوئے چاند کی

زرد کرنیں۔۔۔

مرے ذہن میں تیز نشتر کی مانند

پیوست ہوتی چلی ہیں

وہ یادیں

کہ جن کو میں دفنا چکا

صف بہ صف آکھڑی ہیں

درختوں کے پیچھے

## سوال

رات کے وقت کون بچھڑا تھا

ذہن پر زور دے کے یاد کرو

میری چاہت کے اُجلے دامن پر

یوں نہ اپنی ہوس کے رنگ بھرو

جسم کی لذتوں کے دلدل میں

جو گرا

پھر کبھی نہیں اُبھرا



چاند میں،

چاندنی میں

پھولوں میں،

تُم ہی تُم ہو

تو پھر جُدائی کیا

شکوہِ زخمِ بے وفائی کیا

شوقِ وارفتگی کے عالم میں

جانے کیا تُم نے خط میں لکھ ڈالا!

## پیند

اُونگتے کوچہ و بازار کی آنکھیں جھپکیں  
 شہر کے دل کی خموشی کا فُسوں ٹوٹ گیا  
 دُور کہساروں پہ چاندی کی پھواریں پھوٹیں  
 مسجد و مندر و گر جا کے نگہباں جاگے  
 دُور پنکھٹ پہ کئی تازہ کنول لہرائے

لیکن اب تک —

اُسی پگڈنڈی کی  
 آنکھیں نہ کھلیں ! — — —

## ردِ عمل

شب کے پچھلے پہر

دل کی دہلیز پر

میں نے مانوس قدموں کی آہٹ سُنی

ذہن سے میں نے پوچھا

کہ تُو نے ابھی

کوئی آہٹ سُنی؟

ذہن گویا ہوا

”کوئی آہٹ نہیں“

میں نے پھر ----

آنکھ کے پاس جا کر کہا

”تیری پلکوں کی چلمن اٹھا کر ابھی

کون آیا بتا“

آنکھ پر

ایک سکتہ ساطاری ہوا

آنکھ پتھر اگتی !

# ”سعی رائیگاں“

ہم بھی کتنے نا سمجھ ہیں

ہرنئے سورج

کے آئینے میں

اپنے

خواب ڈھونڈ جا رہے ہیں!

## اِنتِباہ

عذاب آسماں سے  
 اترتا نہیں  
 بستیاں جوں کی تو نہیں  
 تو یہ مت سمجھنا  
 کہ اب آسماں پر۔۔  
 خدا ہی نہیں ہے

## دکن کے گہسار

قطب کے عہدِ وفا کے امنٹ دیارا

تیرے مہکتے تن کا حصار باندھے

نہ جانے کب سے ---

یہ صف بہ صف بے شمار بہت کھڑے ہوئے ہیں

ہزاروں راتیں، بدن میں ان کے اتر چکی ہیں

ہزاروں صبحوں کی سُرخ کر نہیں

رگوں میں ان کی بکھر چکی ہیں

ہزاروں سورج ہیں جذبِ ان میں

ہزاروں سیلاب --

سَر سے ان کے گزر چکے ہیں

---

۱۔ یہاں میں نے خود قطب شاہ اور عام طور سے دکن کے رواج کے مطابق بردزن کتب<sup>۱</sup> باندھلیے۔

مگر یہ پھر بھی

جہاں کھڑے تھے

وہیں کھڑے ہیں۔۔۔۔۔

سیاہ تن پر۔ کہیں تو

زخموں کی چادریں ہیں

سفید لمحوں کی۔۔۔۔۔ چاندنی بھی بچھی ہوئی ہے

یہ سارے پر بت۔۔۔۔۔

خموش رہ کر بھی بولتے ہیں

بغیر آنکھوں کے دیکھتے ہیں

یہ سوچتے ہیں۔۔۔۔۔



کبھی کبھی تو یہ قہقہے بھی لگا چکے ہیں

لہو کے آنسو بہا چکے ہیں

کشادہ دامن میں لہلہاتی

مچلتی بل کھاتی مست ندیاں

رسیلے جھرنوں کے زمزمے ہیں

یہ سارے پرست!

قُطب کی عظمت کے پاسباں ہیں

زمیں پہ رہ کر بھی آسماں ہیں!

وہ چہرہ

(نذرِ غمِ تیری)

وہ اک چہرنا

جو چٹانوں کا سہیہ

پتھر کر

لغے سناتا تھا

وہ اک شعلہ

جو سانپوں کے

گھنے جنگل میں

خوابوں کی

نئی شمعیں جلاتا تھا

وہ چہرہ

جس کی آنکھوں میں

سہلکتے موسموں کا

سرخ ہالہ تھا

پھاڑوں کی بلندی پر  
 ہواؤں سے جو لڑتا تھا  
 انا کے تیز کانٹوں پر  
 جو ننگے پاؤں چلتا تھا  
 وہ کاغذ پر ----

ادھورے خواب چھوڑے  
 دیکھتے ہی دیکھتے  
 نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے  
 گم -----

اب بھی

پھانوں

تیز طولانوں سے لڑتے بادبانوں  
 لکڑ و فن کے آسمانوں میں  
 وہ تہرہ مسکراتا ہے

وہ تہرہ!

## کیوں؟

نور پروردہ زمیں پر رات کا پہرہ ہے کیوں  
آسمان دیوار بن کر راہ میں ٹہرا ہے کیوں

خوشبوؤں کے شہر میں بارود کیسے آگئی  
یہ اچانک بیٹھے بیٹھے میرا دم گھٹتا ہے کیوں

منبر و ناقوس کی بینائی آخر کیا ہوئی ؟  
قربتوں کے نام پر اب فاصلہ ڈستا ہے کیوں ؟

شہر کے دیوار و در پر خاموشی کیوں جم گئی  
ہر گلی کوچے میں میرے گھر کا سناتا ہے کیوں

ہم نئے موسم کے خالق ہیں تو پھر ہم میں نوید  
ٹوٹتے رنگوں کا لاوا روز و شب بہتا ہے کیوں

وہ البیلا مخنور

(نذر تاج مہجور)

وہ اک سیال منظر تھا

جو آنکھوں کے دو آب سے گذر کر

دلوں میں جذب ہوتا جا رہا تھا

وہ اک شاداب جنگل تھا

گھنا شاداب جنگل —

جسے ہر پل سلگتے موسموں کی

دھوپ پی کر

مسکرا نے کا جنوں تھا

تھی سر پر جس کے بھاری رات

لیکن — — —

نگاہوں میں اُجالوں کا فُسوں تھا

وہ البیلا

بحیلا — — —

آ. سنو سی رنگ کا بانکا سخنور

اندھیری رات کے کالے ورق پر  
اُجالا لکھ رہا تھا

سُٹتے لمس کے صحرا میں کب سے  
ہو کے بیل بوٹے بورہا تھا  
اچانک --

ایک پل میں  
نگاہوں سے جو اُوٹھل ہو گیا ہے  
وہ خوابوں کے

تعاقب میں  
اُفق کی اُجلی نیلی وادیوں میں کھو گیا ہے  
پرندہ -- سبز بن کر  
نور کی شاخوں پہ ہر پل جھومتا ہے  
وہ البیلا سخنور!!

ہم خطا وار ہیں اے خدا  
( اکتوبر ۱۹۹۲ء ہمارا شہر میں زلزلوں کی تباہی دوران )

کتنی مدت سے ہم

روشنی سے پرے

اوڑھ کر گھپ اندھیرا تھے سوئے ہوئے

ایک جھٹکا زمیں کو لگا

آنکھ کھلنے لگی ۔۔

اشک پلکوں پہ ہیں

تھر تھراتے ہیں لب

آج تیری طرف

ہاتھ اٹھاتے ہیں سب

مالِکُ الْمَلِک

مُخْتَارِ اَرْض و سَمَاء

تیرے ہاتھوں میں ہیں

آسمان و زمین

تیری آنکھوں میں ہیں

سب مکاں سب ممکن

ہم خطا وار ہیں

ہم گنہگار ہیں

ہم سزاوار ہیں

ہم درندوں سے بڑھ کر بھی خونخوار ہیں !!

ہاں مگر راتِ دن

نام لیکر ترا۔۔۔

سانس لیتے ہوئے

ان چرندوں، پرندوں کی خاطر سہی

چیختی بھاگتی ماؤں کی گود میں

بسانس روکے ہوئے

نہنے معصوم بچوں کی خاطر سہی

اب غضب روک دے۔۔۔

تُو تو غفار ہے

تُو تو سار ہے

تو سزا کا جزا کا بھی مختار ہے

تیری رحمت بڑی ہے غضب سے ترے

رحم کر

رحم کر

اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ

اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ !!!